عہدِ رسالت میں مسلم۔ مسیحی تعلقات کے اسالیب: تجزیاتی مطالعہ

Muslim-Christian Relationships in the Testament: Analytical Study

شگفتہ نوید: پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر، شعبہ علومِ اسلامیہ، گفٹ یونیورسٹی، گوجرانوالہ

ڈاکٹر حافظ طاہر اسلام: لیکچرر، شعبہ فکر اسلامی، تاریخ و ثقافت، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

Abstract:

The solution of many of the contemporary issues pertaining to religion, sociology, geography, ethnicity and language is directly proportional to the harmonic relationship between Christians and Muslims. These two religions should realize that their role in the world peace is far more than the rest ones. The followers of these two religions need to unify at the myths and doctrines that are shared in both. Both have almost the same myths and the code of ethics. Their interfaith harmony also needs a strong look at the socio-cultural backgrounds which both share. In other words, there is need of a deep and serious analysis of the history of Muslim-Christian relations. Particularly, there is required to decipher the dynamics of the relations between the two in the time of Hazrat Muhammad (SAW). He himself tried his best to create a congenial atmosphere for the productive growth of relationships with the Christians. In that era there were exchanged ambassadors, letters, invitations and delegations. The present research article tries to explore the series of efforts that were made to bring reconciliation between the Muslims and the Christians on the part of Muslims

Key Words: Harmony, Hazrat Muhammad (SAW), Muslim-Christian Relations, Peace.

I۔ موضوعِ تحقیق کا تعارف، اہمیت اور پسِ منظر

بین المذاہب تعلقات کا مطالعہ و تجزیہ علمی، سیاسی اور سماجی اعتبار سے بڑی افادیت رکھتا ہے۔ بلاشبہ مذہب حیاتِ انسانی کی ایک ایسی حقیقت ہے جس کی اہمیت ہمہ پہلو ہے۔ خالق و مخلوق کا تعلق ہو، خیر و شر میں حدِّ فاصل کا تعین مطلوب ہو، حیات و ممات کی باریکیوں کی نوعیتیں اور حسّاسیّتیں ہوں، سیاسی و سماجی نظاموں کی تشکیل و تنفیذ کے مراحل ہوں، کوئی معاملہ حیاتِ انسانی کا ایسا تلاش نہیں کیا جا سکتا جس کا بلاواسطہ یا بلواسطہ تعلق مذہب اور اس کے متعلقات سے نہ ہو۔ اسی ناگزیریت کے سبب مذہبی مطالعات ہمیشہ اہمیت کے حامل رہے ہیں ۔انسانوں کی طرف سے مذہب کو غیر معمولی اہمیت دینے کا ایک اہم سبب وہ خواہش ہے جس کے نتیجے میں حیاتِ انسانی امن، برداشت، خوش حالی اور ترقی سے مالا مال ہو جاتی ہے۔ مذاہبِ عالم میں اسلام اور مسیحیت کو بہت سے امتیازات و اعزازات حاصل ہیں۔ انسانوں کی ایک بڑی تعداد ان دونوں مذاہب کی حامل ہے۔ اس عددی اکثریت کے پسِ منظر میں عصرِ جدید کے بہت سے مذہبی، سیاسی، علاقائی ، نسلی، لسانی اور سماجی مسائل کا حل مسلم۔ مسیحی تعلقات کی بہتری سے وابستہ ہے۔ مسلمانوں اور مسیحیوں کو اس اہم نکتے کی

تفہیم کرنی چاہیے کہ عالمی امن کے قیام کے لیے اُن کا کردار دیگر اقوامِ عالم کی نسبت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ دونوں مذاہب سے وابستہ افراد کو اُن عقائد و روایات کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے جو دونوں مذاہب میں مشترک ہیں۔ خدا، رسول، وحی، حیاتِ انسانی، موت، اُخروی زندگی، جنت، دوزخ، خیر اور شر، اَن گنت عقائد و تصورات ایسے ہیں جن میں اسلام اور مسیحیت یکساں فکر و نظر کے حامل ہیں۔ دونوں مذاہب کائنات کی حقیقت کے بارے میں بڑی حد تک ایک جیسی رائے رکھتے ہیں۔ ہم آہنگی سے وابستہ اس مذہبی و تاریخی تناظر کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دونوں اقوام مل جل کر امن کی فضا قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں نہایت ضروری ہے کہ مسلم۔ مسیحی تعلقات کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔ خصوصاً پیغمبر اسلام ﷺ کے مسیحیوں سے تعلقات کی نوعیت اور اُن کے مختلف اسالیب کا تجزیہ کیا جائے۔ مسلم۔ مسیحی تعلقات کے مطالعہ کے ضمن میں خطوط، سفراء، وفود، جنگوں اور معاہدات کا تجزیہ بہت ضروری ہے۔ اِن علمی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہی یہ مضمون تحریر کیا گیا ہے۔ مضمون ہذا کو چھ اجزاء میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے جزو میں موضوعِ تحقیق کا تعارف اور اس کا پسِ منظر واضح کیا گیا ہے۔ دوسرے جزو میں ادیانِ عالم میں مسیحیت کے مقام اور اس کے بنیادی عقائد کی وضاحت کی گئی ہے۔ تیسرے جزو میں مسیحی ادب کی تفصیلات کو بیان کیا گیا ہے۔ چوتھے جزو میں مسیحیت کی ابتدائی تاریخ کے مختلف مراحل واضح کیے گئے ہیں۔ پانچویں جزو میں مسلم۔ مسیحی تعلقات کے اُن اسالیب کا تجزیہ کیا گیا ہے جو عہدِ رسالت میں سامنے آئے۔ اس ضمن میں مکاتیب و سفراء، وفود، غزوات، سرایا اور معاہدات کا تذکرہ کیا گیا۔ چھٹے جزو میں خلاصہ ٔبحث تحریر کیا گیا۔

ii۔ ادیانِ عالم میں مسیحیت کا مقام اور اس کے بنیادی عقائد

مسیحیت کو عالمی مذاہب خصوصاً سامی ادیان میں مختلف الجہات پہلوؤں کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس مذہب کے بانی حضرت مسیحؑ[1] فلسطین کے ایک سرسبز حصہ "گیلی لی"[2] کے ایک چھوٹے سے گاؤں "ناصرہ"[3] میں پیدا ہوئے۔ آپؑ کی پیدائش معجزانہ طور پر بغیر باپ کے عمل میں آئی۔[4] اس اعجاز و افتخار کے باوجود تاریخِ انسانی میں مذہب سے متعلق غلوّ اور مبالغہ آمیزی کی بنیاد پر سب سے زیادہ متنازع فیہ شخصیت بھی آپ کی ہی ہے، یہودیوں کا نقطہ ٔنظر یہ ہے کہ آپ کا دعویٔ نبوت جھوٹا تھا۔[5] یہودی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ تورات کی تعلیمات کے پیشِ نظر ایک نبی کے منتظر تھے[6] مگر حضرت مسیحؑ یہودیوں کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ نبوت کے جھوٹے دعویٰ کے جرم کی پاداش میں آپ کو صلیب پر لٹکا کر مار دیا گیا۔[7] حضرت مسیحؑ کی مصلوبیت سے متعلق مسیحی اہلِ علم اور مؤرخین ایک مختلف نقطہ ٔنظر رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق آپؑ کو صلیب پر چڑھا کر قتل تو یقیناً کر دیا گیا مگر آپ تیسرے روز دوبارہ زندہ ہو گئے ۔ چالیس روز بعد آپ کو آسمانوں پر اٹھا لیا گیا۔[8] مسلمانوں کا موقف ہے کہ حضرت مسیحؑ کو قتل کیا گیا نہ ہی صلیب پر چڑھایا گیا، آپؑ کو جسمانی طور پر زندہ آسمانوں پر اٹھایا گیا،[9] اب آپؑ قیامت سے قبل دوبارہ تشریف لائیں گے۔[10] تینوں سامی ادیان سے وابستہ تاریخی مصادر اور اہلِ علم کی مقبولِ عام رائے کے برعکس مرزا غلام احمد قادیانی کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کی وفات پاک و ہند کے معروف علاقہ کشمیر میں ہوئی۔[11] دلچسپ امر یہ ہے کہ بعض مؤرخین نے حضرت مسیحؑ کو ایک

ایسا فرضی کردار قرار دیا ہے جس کا وجود تاریخِ انسانی کے کسی مرحلہ میں بھی ظہور پذیر نہیں ہوا۔[12] مسیحی مذہب اور اس سے متعلق مختلف واقعات کے بارے میں حتمی اور یقینی معلومات کی عدمِ دستیابی کا ایک اہم سبب اس مذہب کے مذہبی و تاریخی مصادر میں تحریف شدہ روایات کی موجودگی ہے۔ حضرت مسیحؑ کی پیدائش اور وفات کی طرح مسیحی مذہب کی تعریف اور کسی متعین شکل کے بارے میں بھی بہت سے ابہامات پائے جاتے ہیں۔ مسیحی اہلِ علم کسی ایک تعریف پر متفق نظر نہیں آتے۔ مثلاً "The American People's Encyclopedia" میں درج الفاظ ملاحظہ ہوں:

"Christianity: The religion founded by Jesus of Nazareth in the first century A.D. and centering in His life mission and message".[13]

"مسیحیت وہ مذہب ہے جس کی بنیاد پہلی صدی میں مسیح ناصری نے رکھی اور جس کا محور اُن کی زندگی، مقصدِ حیات اور پیغام ہے"۔

James Masteller کا بیان ہے:

"Despite its various forms, Christianity can be recognized by several concepts almost universally accepted: a belief in God as creator, in the Bible as God's word, and Jesus as God's son and the final revelation of God to man in his perfect humanity, sacrificial death and miraculous resurrection and in his ability by this sacrifice and exaltation to mediate for giveness, salvation and immortality to all those who come unto God by him".[14]

"باوجود اس حقیقت کے کہ مسیحیت کی اپنی مختلف اشکال ہیں، یہ مذہب اپنے متعدد عقائد کے اعتبار سے شناخت رکھتا ہے۔ ان عقائد کو عالمگیر سطح پر مسیحیوں میں قبولیت حاصل ہے۔ ان عقائد میں خدا کو خالق ماننا، بائبل کو کلامِ خدا تسلیم کرنا، مسیح کو خدا کا بیٹا ماننا اور انسانیت کی طرف مسیح کو خدا کا آخری مجسم و مکمل پیغام تسلیم کرنا، مسیح کی قربانی پر مشتمل موت اور معجزہ کے طور پر دوبارہ زندہ ہو جانا اور یہ تسلیم کرنا کہ وہ اپنی قربانی اور آسمان کی طرف اٹھائے جانے کی وجہ سے ان تمام لوگوں کو معافی دلانے، نجات دلانے اور لافانی حیات عطا کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو لوگ حضرت مسیح کے توسط سے خدا کی طرف آئیں انہیں یہ عنایات حاصل ہوں گی"۔

"Encyclopedia of Religion and Ethics" کے مقالہ نگار "Alfared E.Garway" نے مسیحیت کی وضاحت جن الفاظ میں کی اُسے اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

"یہ وہ اخلاقی، تاریخی، کائناتی، موحدانہ اور کفارے پر ایمان رکھنے والا مذہب ہے جس میں خدا اور انسان کے تعلق کو خداوند یسوع مسیح کی شخصیت اور کردار کے ذریعے پختہ کر دیا گیا ہے"۔[15]

مذکورہ بالا تعریفات وتوضیحات کے مطالعہ و تجزیہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا قطعاً مشکل نہیں کہ مسیحیت ایک پیچیدہ، مبہم اور بنیادی عقائد سے متعلق مختلف الخیال افراد کا حامل مذہب ہے۔ مسیحیوں خصوصاً ان کے اہلِ فکر و نظر کے ہاں عقائد کی وضاحت میں بڑا تنوّع پایا جاتا ہے۔ لہذا کسی مسیحی عقیدہ یا اصطلاح کی حتمی و یقینی تعریف ایک مشکل امر ہے۔ بہر حال ذیل کی سطور میں اہم اور بنیادی عقائدِ مسیحیت کو بیان کیا جاتا ہے۔

ا۔ عقیدۂ تثلیث (Trinity)

مسیحیت میں خدا کے وجود اور حیثیّت کا عمومی انداز میں اقرار کیا گیا ہے۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ خدا ایک ہمیشہ زندہ رہنے والی ہستی ہے، اسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن پوری طرح سمجھا نہیں جا سکتا۔ اس کی حقیقت کا پورا تجزیہ انسانی ذہن کی قوت سے بالا امر ہے۔ اس کی ذات سے متعلق صرف وہی حقائق معلوم ہو سکے ہیں جو اس نے خود انسانوں کو وحی کے ذریعے بتائے ہیں۔[16] خدا سے متعلق مسیحی عقیدہ کی پوری وضاحت "تثلیث" کے تصور سے سامنے آتی ہے۔ تثلیث ایک پیچیدہ و مبہم مسئلہ ہے جس کی تفہیم یقیناً ایک مشکل امر ہے۔ عقیدۂ تثلیث کے مطابق خدا تین اقانیم (Persons) سے مرکب ہے۔ بعض کے مطابق ان تین اقانیم میں باپ، بیٹا اور روح القدس شامل ہیں۔ اس کے برعکس بعض کا خیال ہے کہ یہ تین باپ، بیٹا اور مریمؑ ہیں۔ باپ سے مراد خالقِ حقیقی، بیٹا سے مراد حضرت مسیحؑ اور مریمؑ سے مراد والدہ مسیح جبکہ روح القدس کی تعریف و تعیین پر بھی اختلاف ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ یہ تین نہیں بلکہ ایک خدا ہے۔ خدا ایک مجموعہ و مرکب ہے۔[17] مسیحیوں کے اس مخصوص عقیدہ کا ایک منفرد پہلو یہ ہے کی تثلیث کا لفظ کتابِ مقدس میں مذکور نہیں۔ پہلی مرتبہ اس اصطلاح کو دوسری صدی عیسوی کے آخر میں طرطلیان نامی ایک مسیحی بزرگ نے استعمال کیا۔[18]

James Hastings نے تثلیث کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

"Trinity: The Christian of God as existing in three persons and one substance".[19]

"تثلیث سے مراد خدا کے بارے میں مسیحیوں کا یہ نظریہ ہے کہ خدا تین اقانیم مگر واحد جوہر کی حیثیت میں وجود رکھتا ہے"۔

خدا کا تین اجزاء میں مرکب ہونا ایک ایسا مخمصہ ہے جس کے متعلق مسیحیت کبھی بھی تسلی بخش جواب فراہم نہیں کر سکی۔ مثلاً "Huston Smith" نے اس مشکل کو یہ کہہ کر آسان کرنے کی کوشش کی ہے کہ عقیدۂ تثلیث کی رُو سے خدا مکمل طور پر واحد بھی ہے اور تین بھی۔ اس سے یہ بھی مراد نہیں کہ ایک واحد ہستی یا اقنوم ہے جس کی تین مختلف حیثیتیں ہیں یعنی جس طرح کوئی شخص ایک ہی وقت میں کسی کا بیٹا، کسی عورت کا خاوند یا کسی شخص کا باپ ہو سکتا ہے۔ بلکہ نہ تو ہم مختلف اقانیم کو آپس میں ملاتے ہیں اور نہ ہی ان کے جوہر کو باہم تقسیم کرتے ہیں۔[20] عالمِ مسیحیت کی طویل تاریخ اور اس

کے اختیار کردہ عقائد کا المیہ ہے کہ جذبات، تخیلات اور نام نہاد روحانیت کے میدان سے نکل کر عقیدۂ تثلیث کی کوئی شماریاتی، حسابیاتی، عقلی اور منطقی تعبیر و تشریح آج تک ممکن نہیں ہو سکی۔

۲۔عقیدہ تجسم(Incarnation)

مسیحیت میں چونکہ حضرت مسیحؑ کو مرکب خدا کا ایک حصہ ظاہر کیا گیا ہے، اس لئے اُن کے مادی وجود سے متعلق عقیدہ تجسم کی صورت میں ایک اہم وضاحت موجود ہے۔ تجسم سے مراد ہے تثلیث کے دوسرے اقنوم یعنی حضرت مسیحؑ کا انسانی شکل میں آنا۔ یعنی خدا اپنی خدائی سے دست بردار ہوئے بغیر انسان بنا۔ [21]

"James Hastings" کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"Incarnation: The word is a non-Biblicaltheological term to state the Christian conviction that in Jesus Christ, God has visited and redeemed His people".[22]

" تجسم کا لفظ ایک غیر انجیلی مذہبی اصطلاح ہے، یہ اس مسیحی عقیدہ کو بیان کرتی ہے کہ خُدا دنیا میں حضرت مسیحؑ کی صورت میں لوگوں کو نجات دلانے کے لئے آیا"

تجسم کے عقیدہ سے متعلق انجیلی بیان ملاحظہ ہو:

"ابتداء میں کلام تھا، اور کلام خدا کے ساتھ تھا، اور کلام خدا تھا، یہی ابتداء میں خدا کے ساتھ تھا۔"[23]

اسی تسلسل میں دوسرا بیان ملاحظہ ہو:

"اور کلام مجسم ہوا، اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا، اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال۔"[24]

مسیحی عقیدہ تجسم کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ ایک ہی وقت میں خدا بھی ہیں اور انسان بھی "خدا" اور "انسان" کے اس اتحاد کو مسیحیت میں ایک اہم عقیدہ کی حیثیت حاصل ہے۔

۳۔عقیدہ مصلوبیت(Crucificion)

مسیحیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب دی گئی۔ مسیحی ایمانیات کے مطابق صلیب کی وجہ سے حضرت مسیحؑ کی وفات ہوئی۔ اکثر مسیحی فرقے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "اقنوم ابن" کو صلیب پر نہیں چڑھایا گیا کیونکہ "اقنوم ابن" تو خدا ہے۔ اس کے بجائے اقنوم ابن انسانی شکل یعنی حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھایا گیا۔ اس عقیدہ کی رو سے "اقنوم ابن" اپنی انسانی حیثیت میں خدا نہیں ہے۔ یعنی صلیب پر "خالق مسیح نہیں بلکہ مخلوق مسیح چڑھا"۔ اس عقیدہ کی اہمیت اور مقبولیت کا ہی اثر ہے کہ صلیب کا نشان (+) مسیحیت کے ہاں بہت مستعمل ہے۔

۴۔عقیدہ حیاتِ ثانیہ(Resurrection)

اس سے مراد یہ مسیحی عقیدہ ہے کہ صلیب پر حضرت مسیحؑ کی وفات ہوگئی اور آپؑ کو دفن کر دیا گیا۔ تیسرے دن آپ پھر زندہ ہوگئے اور اپنے حواریوں کو تعلیم و تربیت پر مشتمل کچھ ہدایات دے کر آسمان پر تشریف لے گئے۔[25]

۵۔عقیدۂ کفارہ(Atonnement)

اس عقیدہ کے مطابق حضرت مسیحؑ نے سولی چڑھ کر تمام انسانوں کے گناہوں کو چُھپالیا ہے اور تمام انسان حضرت مسیحؑ کی اس قربانی کے بدلے نجات حاصل کر لیں گے۔[26] مسیحی اہلِ علم نے کفارہ کے تصور کو خدااور انسان کے درمیان ایک صلح، یکجائی اور مصالحت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ مصالحت حضرت مسیحؑ کی موت قربانی دینے کے نتیجے میں منعقد ہوئی۔[27]مسیحی عقائد کی نوعیت و حقیقت کا ایک اہم اور حسّاس ترین پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں سے اکثر کی حتمی شکل وصورت انجیل میں مذکور نہیں اور نہ ہی یہ عقائد تاریخی اور سندی اعتبار سے حضرت مسیحؑ کی تعلیمات سے براہِ راست ماخوذ ہیں۔[28]اُن عقائد کے وجود اور ان کے مفہوم کی تعیین کے لئے مسیحیت کی تاریخ کے اندر موجود ارتقائی مراحل کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

iii۔ مسیحی ادب

مسیحیت کے مذہبی ادب میں "کتابِ مقدس" کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کتابِ مقدس دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ عہد نامہ قدیم یا عہدِ عتیق کہلاتا ہے جبکہ دوسرے کو عہد نامہ جدید یا عہدِ جدید کا نام دیا جاتا ہے۔ عہد نامہ قدیم سے مراد تورات ہے جو کہ یہودیوں اور مسیحیوں، دونوں کے لئے مقدس حیثیت رکھتا ہے۔ عہد نامہ جدید سے مراد "انجیل" ہے جو کہ مسیحیوں کی مقدس کتاب ہے۔[29]مسیحی دُنیا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کتابِ مقدس (بائیبل) کے دونوں حصے مقدس اور الہامی ہیں۔ نیز یہ کہ "نیا عہد نامہ (انجیل)" نے "عہد نامہ قدیم (تورات)" کی تکمیل کر دی ہے۔[30]

ا۔عہد نامہ قدیم/تورات(Old Testament)

مسیحیوں میں اس کی حیثیت پر قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ ان اُنتالیس (۳۹) صحائف وکتب کو تسلیم کرتا ہے جو یہودیوں کے ہاں الہامی اور مقدس ہیں۔ اس کے برعکس رومن کیتھولک اور بعض دیگر ضمنی فرقے چھیالیس (۴۶) کتب پر اتفاق کرتے ہیں۔[31]بعض مسیحی پچاس (۵۰) کتب کی الہامی حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔[32]عہد نامہ قدیم میں موجود کتب وصحائف کی تعداد کا معاملہ مختلف مسیحی فرقوں اور بائیبل کے مختلف نسخوں تک محدود نہیں بلکہ اس حصے کی بعض آیات پر بھی اختلافات موجود ہیں۔[33]ایسا الہامی کلام جس کا دورانیہ بارہ سو سال پر مشتمل ہو، اس کی تعداد کے بارے میں اتنے ابہامات بہت سے سوالات کو جنم دیتے ہیں۔

۲۔عہد نامہ جدید/انجیل (New Testament)

یہ حصہ مسیحیوں کے ہاں معتبر ہے،اس میں ستائیس (۲۷) کتابیں ہیں۔ یہ وہ کلام ہے جو حضرت مسیحؑ کی آمد کے بعد لکھا گیا۔اس حصہ کی ترتیب وتدوین پر بھی بہت سے سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ مسیحی مؤرخین نے تسلیم کیا ہے کہ دوسری صدی عیسوی تک نئے عہد نامہ کا مستند مجموعہ تیار کرنے کی ابتداء تک نہ ہوئی تھی اور تیسری صدی عیسوی کے آخر تک متنازعہ کتابوں کا وُجود باقی تھا۔[34] کے اصل مصنفین اور بائبل کے مختلف نسخوں میں تضادات واختلافات کی وجہ سے بہت سے ابہامات پائے جاتے ہیں۔ دیگر مذاہب کے حاملین سے قطع نظر خود مسیحی پادریوں کو بھی شرح صدر حاصل نہیں۔۱۹۷۹ء میں ایک سروے کرایا گیا،اس کے تحت دس ہزار پادریوں کو ایک سوال نامہ ارسال کیا گیا۔اس میں ایک سوال تھا کہ کیا آپ بائیبل کو خدا کا الہامی کلام تسلیم کرتے ہیں۔ بیاسی(۸۲) فیصد میتھوڈسٹ،اکیاسی(۸۱)فیصد پریسبیٹیرین اور ستاون(۵۷) فیصد بیپٹسٹ پادریوں کا جواب نفی میں تھا۔[35] بائیبل کے متن میں موجود اغلاط و تضادات اہلِ علم کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اس کی تحریر وترتیب میں انسانی دخل کے امکان کو تسلیم کریں اور یہ تسلیم کیا جانا بھی ضروری ہے کہ اس کی مذہبی قدر وحیثیت بھی مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہے۔

iv۔مسیحیت کی ابتدائی تاریخ

مسیحیت کے عقائد اور اس کے بنیادی مصادر کی طرح اس کے فروغ کے لئے کئے گئے ابتدائی اقدامات کے بارے میں معلومات بھی زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ حضرت مسیحؑ کی حیاتِ طیبہ کے چند دن ہی ایسے ہیں جن کے بارے میں باوثوق تفصیلات موجود ہیں۔[36] اسی بنیادی وجہ کے پیشِ نظر حضرت مسیحؑ کی کسی حقیقی سوانح عمری کا لکھا جانا ممکن نہیں ۔[37] آپؑ کے حالاتِ زندگی سے متعلق جو معلومات دستیاب ہیں ان کا مأخذ بائیبل اور قرآن مجید کے علاوہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی بعض احادیث ہیں۔ بائیبل کا مواد بہت سے مسیحیوں کے ہاں بہت کم قابل اعتماد ہیں۔[38] جبکہ قرآن واحادیث کی معلومات آپؑ کی پوری حیاتِ طیبہ کا احاطہ نہیں کرتیں۔ منتخب موضوعات ومواقع کے بارے میں دستیاب معلومات کے سہارے پوری زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر کسی تفصیلی کتاب کا لکھا جانا ممکن نہیں۔ آپ کے بعد مسیحیت کس شکل میں موجود رہی، یہ بھی ایک ایسا سوال ہے جس کا تسلی بخش جواب نہیں دیا جا سکتا۔ بعض روایات کے مطابق آپ کی تبلیغ کا واحد مقصد بنی اسرائیل کی اصلاح تھا۔[39] یہی وجہ ہے کہ آپؑ نے بنی اسرائیل کے لئے کسی الگ مذہب یا شریعت کو ضروری خیال نہیں کیا۔[40] نہ یہودیوں سے الگ ہو کر کسی عبادت گاہ کی تعمیر کی۔ آپؑ یہودیوں کی عبادت گاہوں میں ہی عبادت کرتے رہے۔[41] آپؑ کے بعد آپ کے حواری بھی یہودی عبادت گاہوں میں جا کر عبادت کرتے رہے۔ پطرس اور یوحنا عبادت ودعا کے لئے ہیکل میں جایا کرتے تھے۔[42]

تاریخِ مسیحیت کے مختلف مصادر کے مطالعہ وتجزیہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مسیحیت نے بتدریج تعلیماتِ مسیحؑ سے فرار کی راہ اختیار کی ہے۔اس فرار کا سب سے اہم سبب Saint Paul ہے۔اسے عرفِ عام میں پولس کہتے ہیں۔ اُس نے مسیحی مذہب کو یکسر تبدیل کر دیا۔[43] پولس نے مسیحیت کو وہ نئی عمارت عطا کی جس کی بنیادیں

حضرت مسیحؑ اور ان کے حواریوں کی تعلیمات سے خالی تھیں۔ بعض مسیحی اہلِ علم کا موقف ہے کہ اُس نے یونانی فلسفہ و مذہب کی مشرکانہ توہم پرستیوں کو مسیحیت کا حصہ بنا دیا۔[44] اگر یہ کہا جائے کہ پولس نے حضرت مسیحؑ کے دین سے مختلف ایک دین کی بنیاد رکھی تو غلط نہ ہوگا۔ ستم بالائے ستم اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ پولس کے بارے میں ملنے والی بہت سی معلومات غیر یقینی ہیں۔[45] اُس کا اصل عبرانی نام ساؤل یا شاؤل تھا، پولس اس کا رومی نام تھا۔ وہ یہودی تھا اور رومیوں کی غلام قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ غلام ہونے کے باوجود اسے رومی سلطنت کے مکمل شہری حقوق حاصل تھا۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں اور اُن پر ایمان لانے والوں کا بدترین دشمن تھا۔ بعد میں اس نے نہ صرف یہ کہ مسیحیت کو قبول کیا بلکہ پوری مسیحیت پر علمی طور پر قبضہ کر لیا۔[46] موجودہ مسیحی مذہب اس کی تعلیمات پر قائم ہے۔

سیاسی اعتبار سے اگر تاریخِ مسیحیت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی عیسوی کی ابتداء تک مسیحیوں پر رومیوں کا غلبہ تھا، مسیحی مؤرخین اسے دورِ ابتلاء (Age of persecution) قرار دیتے ہیں ۳۰۶ء مسیحیت کی تاریخ میں ایک بہترین سال تھا۔ اس سال قسطنطین اول روم کا بادشاہ مقرر ہوا۔ اس نے مسیحیت کو قبول کیا اور مسیحیت کو استحکام بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یوں چوتھی اور پانچویں صدی میں مسیحی پادریوں کی بڑی بڑی کونسلیں منعقد ہوئیں۔ معروف نیقیہ کونسل بھی ۳۲۵ء میں منعقد ہوئی۔ چوتھی اور پانچویں صدی کو عہدِ مجالس (Age of Councils) یا عہدِ مباحثات (Controversy Period) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ۳۱۳ء سے ۵۳۹ء تک کا دور سلطنتِ روم پر مسیحیت کے غلبے کا دور ہے۔ اس عہد میں مسیحیت دو سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی۔ مشرقی سلطنت کا دار الحکومت قسطنطنیہ تھا۔ اس میں بلقان، یونان، ایشائے کوچک، مصر اور حبشہ کے علاقے شامل تھے، وہاں کا مذہبی پیشوا بطریرک (Patriarch) کہلاتا تھا جبکہ مغربی سلطنت کا مرکز بدستور روم تھا، یورپ کا اکثر حصہ اسی سلطنت کے تحت تھا، وہاں کا مذہبی پیشوا "پوپ" یا "پاپا" کہلاتا تھا۔ یہ دونوں سلطنتیں ایک دوسرے کی مخالف تھیں۔ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدیاں مسیحیت کی تاریخ میں تاریک زمانے (Dark Ages) سے تعبیر کی جاتی ہیں۔ یہ مسیحیوں کے سیاسی و علمی زوال کا دور ہے۔[47] اسی عہد میں عرب کی سرزمین پر اسلام کو علم و فکر اور سیاست و سماج کے میدان میں فیصلہ کن غلبہ حاصل ہو گیا۔ اسلام کے شیدائیوں اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے وفاداروں نے محض ایک صدی میں شرق و غرب کی تمام طاقتوں کو مغلوب کر لیا۔ یہ وہ حسّاس ترین دور تھا جب مسیحیت کو اسلام کی قوت کا سامنا تھا۔ مقابلہ علم و عقل کے میدان میں بھی تھا اور سیاست و قوت کے میدان میں بھی۔

v۔ عہدِ رسالت میں مسلم مسیحی تعلقات کے اہم اسالیب

اسلام اور مسیحیت سے وابستہ افراد کے تعلقات کی حقیقت و نوعیت کی تفہیم کے لئے ان عقائد کا تذکرہ بہت ضروری ہے جو دونوں ادیان میں مشترک ہیں مثلاً دونوں مذاہب وحی کو ذریعۂ ہدایت سمجھتے ہیں، خالقِ حقیقی کی عظمت کے قائل ہیں، سلسلۂ رسالت پر یقین رکھتے ہیں، حیات بعد الموت کے نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں نیز خیر کے حامی اور شر کے مخالف ہیں۔ ان مشترکات کا ہی اثر ہے کہ دونوں مذاہب کے حاملین کائنات کی حیثیت، احتساب و جواب دہی اور انسانی

فلاح کے بہت سے افکار و نظریات کے متعلق کم و بیش ایک جیسی سوچ رکھتے ہیں۔ مسیحیوں کو مسلمانوں میں "اہلِ کتاب" کا درجہ حاصل ہے۔ مسیحیوں کے پاس موجود کتاب یعنی انجیل میں حضور ﷺ کی بعثت کی بشارات موجود تھیں اور آپ ﷺ کی باکمال صفات کا تذکرہ بھی تھا۔[48] ان بشارات کو مسیحی لوگ اپنے کلیساؤں، گرجوں، کنیسوں اور عبادت گاہوں کے پڑھنے پڑھانے کے حلقوں میں ایک دوسرے کو سُناتے اور دُہراتے رہتے تھے۔ مسیحیوں کے پادری، کاہن اور دینی مشائخ اس ضمن میں بڑے پرُجوش تھے۔ وہ ایک دوسرے کو نصیحت و تلقین کرتے رہتے تھے، یہاں تک کہ محمدِ عربی ﷺ کی آمد کی خبریں خاص و عام تک پہنچ گئیں۔ یہ اُس نبی ﷺ کی آمد تھی جس کی تلاش میں نصرانی علماء نے کوئی کسر اُٹھانہ رکھی تھی۔ ہر راہب مرتے وقت دوسروں کو اس بات کی وصیت کر کے جاتا تھا کہ تلاش و جستجو کے اس عمل کو جاری رکھنا۔ مسیحی علماء کے اس عزم کا اظہار حضور ﷺ کے بچپن میں پیش آنے والے ایک معروف واقعہ سے بھی ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے جب اپنے چچا حضرت ابو طالب کے ہمراہ شام کی طرف اپنا پہلا تجارتی سفر فرمایا تو راستہ میں بحیرہ نامی ایک راہب سے ملاقات ہوگئی، اس نے آپ کی شانِ پیغمبری کو پہچان لیا، اس نے مشورہ دیا کہ آپ کو واپس بھیج دیا جائے، چنانچہ اس نصیحت پر عمل کیا گیا۔[49] مسیحیوں کے علمی حلقوں میں حضور ﷺ کی آمد کی بازگشت کا اندازہ حضرت سلمان فارسی کے ایمان لانے کا واقعہ سے بھی بخوبی ہو جاتا ہے، ہدایتِ حقیقی کی تلاش کے لئے وہ مختلف مسیحی پادریوں سے ملاقات کرتے رہے اور مشکلات سے بھرپُور اس طویل سفر کو جاری رکھنے میں پُر عزم نظر آئے۔ بالآخر آپ کو مدینہ میں آکر حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوگئی اور آپ کو وہ تمام نشانیاں حضور ﷺ میں مل گئیں جو آپ نے مختلف مسیحی پادریوں اور راہبوں سے تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل میں سُن رکھی تھیں۔[50]

اس نظریاتی ہم آہنگی کا ایک اہم سبب مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ تورات و انجیل الہامی کتب ہیں اور ان میں موجود ہدایات و تعلیمات اگر قرآن مجید سے متصادم نہ ہوں تو مسلمانوں کے لئے مفید و مناسب ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت مسیحؑ کا احترام ہر دو مذاہب میں بہت ضروری خیال کیا جاتا ہے، قرآن مجید کو مسلمانوں میں آخری الہامی کتاب قرار دیا جاتا ہے اور اسے سابقہ کتب و صحائف کا جامع سمجھا جاتا ہے۔ مسلم مسیحی فکر میں موجود اسی یکسانیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں نے اہلِ کتاب کو ﴿كَلِمَةٍ سَوَاءٍ﴾[51] کی طرف آنے کی دعوت دی۔ مشترک فکر کے پسِ منظر میں ملنے والی اسی دعوت کا نتیجہ تھا کہ مسیحیت سے وابستہ بعض افراد دینِ اسلام کی آغوش میں آگئے، بعض نے تذبذب کی روش اختیار کی، بعض عناد و حسد کا شکار ہوگئے اور مسلمانوں سے مسلسل تصادم کی راہ ہموار کرتے رہے۔ موافقت و تعاون کی ایک اچھی مثال ورقہ بن نوفل کی ہے، آپ ایک جیّد مسیحی عالم تھے، آپ حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی تھے۔ حضور ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو حضرت خدیجہ حضور ﷺ کو ساتھ لے کر اُن کے پاس تشریف لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل نے حضور ﷺ کو نبی کی حیثیت سے شناخت کر لیا، ثابت قدمی اختیار کرنے سے متعلق مشورے دیئے اور آپ ﷺ کی نُصرت و حمایت کرنے کی یقین دہانی کرائی۔[52] ورقہ بن نوفل کے قبولِ اسلام میں مؤرخین نے اختلاف کیا ہے، آپ ہجرت مدینہ سے قبل وفات پا چکے تھے، آپ کے مناقب میں بعض روایات بھی ملتی ہیں مثلاً حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا

کہ ورقہ بن نوفل کو بُرا بھلا نہ کہو، میں اسے جنت میں دیکھتا ہوں۔[53] ایک دوسری روایت بھی حضرت عائشہ سے ہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ورقہ بن نوفل کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں ورقہ بن نوفل کو دیکھا ہے، وہ سفید لباس زیبِ تن کئے ہوئے تھے، اگر وہ جہنمی ہوتے تو اُن کا لباس کوئی دوسرا ہوتا۔[54]

قطع نظر اس بحث کے کہ ورقہ بن نوفل کے ایمان کی حقیقت کیا تھی یا اُن سے متعلق روایات کی سندی حیثیت کیا ہے، یہ امر مسلمہ ہے کہ حضور ﷺ سے پہلے مسیحی شخص کا رابطہ نہایت خوش گوار، حوصلہ افزاء اور تعاون پر مبنی تھا۔ اسی نوعیت کی ایک شگفتہ و شائستہ مثال جارود بن عمرو کی ہے، اُن کا تعلق قبیلہ بنو عبدالقیس سے تھا اور وہ مذھباً مسیحی تھے۔ حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے اُن کے سامنے اسلام کا پیغام پیش فرمایا۔ جارود نے عرض کی کہ میں نے پہلے ہی ایک دین اختیار کر رکھا ہے، اگر میں اُس دین کو چھوڑ کر آپ ﷺ کے دین کو قبول کر لوں تو کیا اللہ تعالیٰ مجھے عذاب نہیں دے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے مزید ترغیب دی تو اُس نے شرفِ اسلام پالیا۔ حضور ﷺ نے اس موقع پر فرحت و خوشی کا اظہار فرمایا۔[55] ابتدائی ایامِ اسلام میں مسیحیوں سے متعلق بہت سی ایسی دیگر مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ بہت سے مسیحیوں کے قبولِ اسلام کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ دونوں مذاہب دین کی ساخت، تشکیل و تعمیر اور ارتقاء کے بارے میں مشترک سوچ رکھتے ہیں۔ البتہ مسیحیوں کی ایک بڑی تعداد نے مسلمانوں سے مخاصمانہ روش بھی اختیار کئے رکھی۔ مسلمانوں کی طویل تاریخ میں مسیحیوں کے ساتھ تعلقات اور روابط کی تفصیل معلوم کرنا ہو تو رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے درج ذیل اسالیب کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

الف۔ مکاتیب و سفراء

ب۔ وفود

ج۔ غزوات و سرایا

د۔ معاہدات اور صلح نامے

الف۔ مکاتیب و سفراء

پیغامِ خُدا کو امت تک پہنچانا آپ ﷺ کے فرائض منصبی میں شامل تھا،[56] یہ پیغام تمام حکومتوں، علاقوں اور اقوام و قبائل تک پہنچانا تھا۔ اہلِ کتاب جن میں مسیحی بھی شامل تھے اُن کی طاقتور حکومتیں تھیں جبکہ مسلمان حکومت وطاقت اور دولت و شوکت کے اعتبار سے بہت پیچھے تھے۔ طاقت کے اس عدم توازن کے باوجود مختلف سفراء کے ہاتھوں سلاطین کو مکاتیبِ نبوی ﷺ ارسال کئے گئے اور حکیمانہ انداز میں دعوتِ اسلام کو آگے بڑھایا گیا۔ اس ضمن میں خصوصی اقدامات کئے گئے، ہر حکمران کے لئے ایسے سفیر کا انتخاب کیا گیا جو اس کے مرتبہ و حیثیت کے مطابق گفتگو کر سکے نیز وہ سفیر وہاں کے سیاسی و جغرافیائی حالات سے واقف ہوتا تھا، اس ملک کی زبان بھی جانتا ہوتا تھا۔ اِن مکاتیب میں درج نکات اتنے پُر اثر تھے کہ غیر عرب دُنیا اور طاقتور حکومتوں کے لئے بھی یہ بڑا چیلنج ثابت ہوئے۔ مسیحی حکمرانوں کی طرف بھی یہ مکاتیب بھیجے گئے۔ حبشہ کے حکمران نجاشی کی طرف عمرو بن امیہ ضمری، یمامہ کے حاکم ہوذن بن علی کی

طرف سلیط بن عمرو، ہجر کے حاکم منذر بن ساویٰ کی طرف علا بن حضرمی، عمان کے حاکموں جیفر اور عباد کی طرف عمرو بن العاص، قیصرِ روم کی طرف دحیہ کلبی اور غسان کے حکمران منذر بن حارث بن ابی شمر کی طرف شجاع بن وھب اسدی کو بھیجا گیا۔ سب سفراء کی واپسی رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران ہی ہو گئی سوائے حضرت علا بن حضرمی کے۔ حضور ﷺ کے وصال کے وقت وہ بحرین میں تھے۔[57]

ب۔ وُفود

رسول اللہ ﷺ کی سیاسی و دعوتی جدوجہد میں فتح مکہ (۸ھ) کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس فتح کی وجہ سے اسلام کی راہ میں رکاوٹ بننے والی عربوں کی سب سے بڑی طاقت کا خاتمہ ہو گیا اور خاص و عام کے لئے قُبولِ اسلام کی راہ ہموار ہو گئی۔ مختلف قبائل کے لوگ بارگاہِ رسالت ﷺ میں پہنچنے لگے، یہ لوگ خود بھی مشرف بہ اسلام ہوتے اور واپس جا کر اپنی قوم کو قُبولِ اسلام کے لئے تیار کرتے۔ اسی صورتِ حال کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا﴾[58]

"جب اللہ تعالیٰ کی مدد آ پہنچی اور فتح بھی حاصل ہو گئی تو آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول دینِ خداوندی میں داخل ہو رہے ہیں۔ آپ اپنے رب کی تعریف کی ساتھ تسبیح کیجئے اور اس سے مغفرت طلب کیجئے، بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔"

"مجمع بحار الانوار" میں ان حالات و واقعات کی منظر کشی جس انداز میں کی گئی ہے اُس کا مفہوم ان الفاظ میں واضح کیا جاتا ہے:

"یہ سال آمدِ وفود کا سال تھا، قبائلِ عرب نے اسلام کے ساتھ قریش کے معاملے کا انتظار کیا تھا کیونکہ قریش ہی پیشوا تھے اور بیت اللہ کے ذمہ دار تھے، جب مکہ فتح ہو گیا تو انہوں نے اور قبیلۂ ثقیف نے اسلام کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا، اُنہوں نے محسوس کر لیا کہ اب ان کے اندر اسلام کے مقابلے کی سکت نہیں، اس وقت ہر طرف سے وفود کی کثرت ہوئی اور لوگ گروہ در گروہ اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے"۔[59]

وُفود کی ابتداء تو فتح مکہ کے فوراً بعد یعنی ۸ھ کے اخیر سے ہوئی تھی مگر ان میں تیزی کا عنصر ۹ھ اور ۱۰ھ میں داخل ہوا۔ ان وفود کا بہت اچھا استقبال کیا جاتا، ان کی مہمان نوازی کی جاتی، ان کی حوصلہ افزائی اور دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی۔ ان کو انعامات سے نوازا جاتا، ان کی پریشانیوں اور غموں کے مواقع پر شریک ہوا جاتا، "دار الضیافۃ" کے نام سے ایک مہمان خانہ بنایا گیا، ہر خاص و عام کو اس مقام کا علم تھا۔[60] مسلم مسیحی تعلقات کے ابتدائی مراحل کی تفہیم کے لئے صرف اُن وفود کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے جن کا تعلق مسیحیت سے تھا۔

وفدِ نجران، وفدِ تغلب، وفدِ جذام، وفدِ فروہ بن عمرو جذامی، وفدِ عدی بن حاتم طائی، وفدِ بنی عبد القیس، وفدِ سلمان فارسی، وفدِ بلی، وفدِ غسان، وفدِ بنو دار

ج۔ غزوات و سرایا

رسول اللہ ﷺ نے جو جنگیں کیں اُنہیں اصطلاحاً غزوات و سرایا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر اپنی فوج کی سربراہی آپ ﷺ خود کر رہے ہوتے تو یہ جنگ "غزوہ" کہلاتی اور اگر کسی اور کو نمائندہ بنا کر سربراہی عطا کرتے تو یہ جنگ "سریہ" کہلاتی۔ غزوات کی تعداد میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک یہ چھبیس ہیں اور بعض کے نزدیک ستائیس، بعض ان دونوں آراء سے اتفاق نہیں کرتے، البتہ سرایا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔[61] غزوات و سرایا عظیم مقاصد کے حامل ایسے جنگی معرکے ہیں جن کے ذریعے انسانوں کو ہدایت ملی، ظلم کا خاتمہ ہوا اور انسانی حقوق کا تحفظ ممکن ہوا۔[62] مسلمانوں کو یہ جنگی معرکے مختلف مذاہب کے حاملین کے ساتھ پیش آئے۔ مسلمانوں کو مشرکین، یہود، نصاریٰ اور بعض لا دین گروہوں کے خلاف لڑنا پڑا۔ مسیحیوں کے خلاف مسلمانوں کو عہدِ رسالت میں جو جنگیں لڑنا پڑیں ان کی فہرست ذیل میں درج ہے۔

غزوہ دومۃ الجندل، سریہ دومۃ الجندل، سریہ ذات اطلاح، غزوۂ موتہ، سریہ عمرو بن العاص، غزوۂ تبوک، سریہ اسامہ بن زید

د۔ معاہدات

مسلم مسیحی تعلقات کی تاریخ میں باہمی معاہدات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ معاہدات تلاشِ حق کی جُستجو، انسان دوستی، صبر و برداشت، عہد و پیمان کی تکمیل کے عزم اور اسلامی ریاست کی تشکیل کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ ذیل میں ان معاہدات کی فہرست درج کی جاتی ہے جو عہدِ رسالت میں مسلمانوں نے مسیحیوں سے مختلف اوقات اور علاقوں میں طے کئے۔

1. دومۃ الجندل کے فرماں روا اکیدر کے ساتھ معاہدہ
2. ایلہ کے فرمانروا یحنہ بن رؤبہ کے ساتھ معاہدہ
3. اہلِ جرباء اور اہلِ اذرح کے ساتھ معاہدہ

عہدِ رسالت کا مسلم مسیحی تعلقات کے تناظر میں مرحلہ وار جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مسیحیت نے اسلام کی دعوت کا مقابلہ گستاخانہ انداز میں نہیں کیا۔ عالمِ مسیحیت پر ادب و احترام، اعزاز و اکرام، تہذیب و شائستگی اور تلاشِ حق کی فکر غالب رہی ہے۔ اس کے برعکس کسریٰ ایران نے حضور ﷺ کے مکتوب گرامی کی توہین کی اور قاصدِ رسول کے سامنے رعونت و تکبر اور نفرت و کینہ کا اظہار کیا۔ یہود نے بھی عیاری و مکاری سے کام لیا۔ مسیحی حکمرانوں اور اُن کی رعایا نے اسلام کی طرف قبولیت کا جذبہ رکھا، مکاتیبِ نبوی کی تعظیم کی گئی، سفیرانِ رسول کا احترام کیا گیا، حضور ﷺ کو تحائف ارسال کئے گئے، حضرت ماریہ قبطیہ کو عالمِ مسیحیت کی طرف سے عالمِ اسلام کو عظیم تحفہ قرار دیا

جائے تو غلط نہ ہوگا، ماریہ قبطیہ کے بطنِ اقدس سے حضورﷺ کے آخری صاحبزادے حضرت ابراہیم کی پیدائش ہوئی۔ مسیحیوں کی اسلام سے متعلق سوچ کا اندازہ اُن روایات کے مطالعہ سے بھی ہوتا ہے جن کے مطابق شاہِ روم ہرقل کی اگلی نسلوں نے حضورﷺ کے مکتوبِ گرامی کی حفاظت کی اور اُسے ریشمی غلاف میں رکھا، جس صندوق میں اُسے محفوظ کیا گیا وہ نہایت قیمتی ہاتھی دانت سے بنایا گیا تھا۔ نجاشی کے طرزِ عمل کو مسیحیت کا نمائندہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ مسلمان ہوگیا، حضورﷺ نے اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔ مسیحیوں کے قبولِ حق پر آمادہ کرنے والے انہی رویّوں کے پسِ منظر میں ان آیاتِ مبارکہ کا مفہوم متعین کرنے کی ضرورت ہے:

﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾[63]

"جو لوگ نبی اُمی یعنی محمدﷺ کی اتباع کرتے ہیں، وہ اس نبی کے بارے میں تورات و انجیل میں لکھا ہُوا پاتے ہیں، وہ انہیں معروف کاموں کے کرنے کا حکم دیتے ہیں اور منکرات سے منع کرتے ہیں۔ وہ ان کے لئے پاک اشیاء کو حلال کرتے ہیں اور ناپاک اشیاء کو حرام قرار دیتے ہیں، اُن پر سے بوجھ اور طوق جو اُن کے سر پر اور گلے میں ہے اُتارتے ہیں۔ پس جو لوگ اُن پر ایمان لائے اور اُن کے ساتھ رہے، اُن کی مدد و نُصرت کی اور اُس نور کی اتباع کی جو اُن کے ساتھ نازل ہوا، یہی لوگ کامیاب ہیں۔"

مسیحی اہلِ علم اور عوام کی اکثریت کا رویہ اسلام سے متعلق مصالحانہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ نجران سے آنے والے مسیحی وفد نے حضورﷺ کے ساتھ مباہلہ کرنے سے گریز کیا، ہرقل نے محتاط رویہ اختیار کیا، ورقہ بن نوفل نے خواہش کی کہ وہ آپﷺ کی مدد کرے گا۔ دوسری طرف مسلمانوں نے بھی مسیحیوں سے رواداری اور تفہیمِ مسائل کے رجحانات اپنائے۔ ان کے وفود کا احترام کیا گیا، ان کی مہمان نوازیاں کی گئیں، تحمل و تدبُّر سے ان کی بات سُنی گئی، اُن کے بارے میں قرآنی ہدایات کا نُزول ہُوا، تاریخ کے مختلف مراحل سے مشترک اقدار کو تلاش کیا گیا، مسیحیوں کے وفود کے صرف دو نتائج سامنے آتے ہیں، یا تو وہ قُبولِ اسلام کی سعادت پا گئے یا صلح کر کے چلے گئے اور لڑائی جھگڑے کو دونوں اطراف سے ناپسند کیا گیا۔

بعض مسیحیوں کی طرف سے ایک دوسرا رویہ اپنایا گیا، انہوں نے مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کا راستہ اختیار کیا، مسلمانوں کے قافلوں کو تنگ کیا، ان کے سفراء کو پریشان کیا تو ضروری خیال کیا گیا کہ ان سے نمٹا جائے، اس ضمن میں مسلم مسیحی جنگوں کی نوبت آئی، جنگِ موتہ اور غزوۂ تبوک اس کی اہم مثالیں ہیں، رومیوں سے مسلمانوں کی عسکری چپقلش ہوئی، نوبت قتال و تباہی تک نہ پہنچی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب مسیحیوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدات اور صلح ناموں کی ضرورت محسوس کی، مسلم مسیحی رواداری اور حُسنِ سلوک کی بے مثل یادگاریں رہتی انسانیت کے لئے قائم کی

گئیں۔ مسیحیوں کے مصالحت پر مبنی خیالات وجذبات کا جواب نیکی اور خیر سگالی سے دینے کی ہدایت قرآنِ مجید نے ان الفاظ میں کی:

﴿وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَهُنَا وَإِلَهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾[64]

"اور اہلِ کتاب کے ساتھ مت جھگڑو، مگر اس طریقے سے کہ بہت اچھا ہو، جو اُن میں سے ظلم کا ارتکاب کریں اُن کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرو، اور کہو کہ جو کچھ ہم پر نازل ہوا اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ،ہم سب اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارا اور تمہارا الہ ایک ہی ہے اور ہم اس کا حکم ماننے والے ہیں۔"

مسلمانوں نے بہر صورت مذہبی رواداری کا مظاہرہ کیا اور مسیحی قبائل کو اُس وقت تک کسی انداز میں بھی پریشان نہیں کیا جب تک کہ اُن کی طرف سے کسی زیادتی کی اطلاع نہ آئی۔ مسلمانوں کی احتیاط کا عالم یہ تھا کہ طے شدہ مقدار سے زیادہ جزیہ وصول کرنے والے کی باز پُرس کی جاتی۔[65] عہدِ رسالت مآب ﷺ میں مسیحیوں کے ساتھ نرمی، احترام اور آزادیٔ فکر پر مشتمل تعلقات کا ہی اثر تھا کہ عہدِ خلافتِ راشدہ میں بھی ان سے حُسنِ سلوک کی راہ ہموار کی گئی، ان سے کئے گئے عہد نبھائے گے۔[66] اسی صالح فکر کا نتیجہ ہے کہ مسیحیوں کی ایک بڑی تعداد نے صدیوں تک مسلم حکومتوں کے زیرِ انتظام امن و اطمینان کی زندگی گزاری، انہیں عزت ملی اور اپنی صلاحیت کے مطابق کام کاج کے مواقع بھی میسر آئے، البتہ جب انہوں نے خود ہی عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو انہیں قید و بند اور دیگر مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

vi۔ خلاصہ بحث

پیش کردہ گزارشات کا حاصل یہ ہے کہ مسلم۔ مسیحی تعلقات کی ابتداء عہدِ رسالت میں ہی ہو گئی تھی۔ چونکہ اسلام اور مسیحیت کی فکر میں بہت سے اشتراکات پائے جاتے ہیں اس لیے حضور ﷺ نے مسیحیوں سے بات چیت، مکالمہ اور افہام و تفہیم کے اسالیب کو اختیار کرنے میں مستعدی و تحرک کا مظاہرہ فرمایا۔ اسی رویے کے ردِ عمل میں بہت سے مسیحیوں نے قبولِ اسلام کا شرف پالیا۔ بعض مسیحی حسد و بغض کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہو گئے۔ مسلم۔ مسیحی تعلقات کی تاریخ کے مطالعہ کے ضمن میں عہدِ رسالت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ حضور ﷺ نے مکاتیب، سفراء، وفود، غزوات، سرایا، معاہدات اور صلح ناموں کے ذریعے ان تعلقات کو درست ڈگر پر رکھنے کی کوشش کی۔ یہ تاریخ آج کے سیاسی و مذہبی مسائل کے حل کے لیے ایک بہترین مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1 قرآنِ مجید میں حضرت مسیحؑ کو عیسیٰ کے نام سے بھی ذکر کیا گیا ہے (مریم۱۹: ۳۴) جبکہ بائیبل میں صرف مسیح نام درج ہے۔

2 یہ شمالی اسرائیل کا پہاڑی علاقہ ہے جسے عربی میں "الجلیل" کہا جاتا ہے حضرت عیسیٰؑ نے تیس سال اسی علاقہ میں دعوت وارشاد کے فرائض انجام دیئے۔

(https://en.wikipedia.org/wiki/Galilee,Date:06-08-2018,Time:10:50AM)

3 "ناصرہ" نامی گاؤں بیت المقدس سے ستر میل شمال میں اور بحر روم سے مشرق کی جانب بیس میل کے فاصلہ پر موجود ہے۔ اسی گاؤں کی نسبت سے حضرت مسیحؑ کو یسوع ناصری بھی کہا جاتا ہے۔ (دریابادی، مولانا عبدالماجد۔ تفسیر ماجدی۔ لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، ۲۰۰۱ء، ص: ۲، حاشیہ ۲۱۸)

4 حضرت مسیحؑ کی والدہ مریمؑ تھیں، حضرت مریمؑ کے کنوارے پن اور حضرت مسیحؑ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے پر قرآن مجید اور انجیل دونوں کا اتفاق ہے۔ البتہ انجیل میں حضرت مریمؑ کی یوسف نجار سے منگنی کا ذکر ہے۔
(مریم۱۹ :۲۰-۲۱، متی۱ : ۱۸-۲۵)

5 متی۶۳: ۲۶،۶۸

6 متی۳: ۱۱،۶۳: ۲۶

7 The Crucifixion By An Eye Witness, Indo American Book Company,Chicago,1911,P.10

8 لوقا۶۶: ۲۲، متی۳۲: ۲۶-۲۷، مرقس۱۵: ۱۶-۲۶، یوحنا۱: ۲۴-۱

9 النساء۴: ۱۵۷،۱۵۸

10 البخاری، محمد بن اسمعیل (م۲۵۶ھ)۔ الجامع الصحیح۔ ریاض: دارالسلام للنشر والتوزیع۔ ۱۹۹۹ء، باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام، ص: ۵۸۱، رقم الحدیث: ۳۴۴۸؛ مسلم بن حجاج (م۲۶۱ھ)۔ الجامع الصحیح۔ باب فی فتح قسطنطنیہ و خروج دجال و نزول عیسیٰ ابن مریم، دارالسلام، الریاض، ۱۹۹۹ء، رقم الحدیث: ۱۲۵۴، ۷۲۷۸

11 قادیانی، مرزا غلام احمد (م۱۹۰۸ء)۔ مسیح ہندوستان میں۔ انڈیا: قادیان، ۱۹۰۸ء، ص: ۱۸

12 ملاحظہ ہوں: نیاز فتح پوری۔ مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ۔ لاہور: آواز اشاعت گھر۔ س ن، ص: ۴۶، ۴۷؛ www.Boaringchristianity.org

13 The American People's , Encyclopedia,Chicago,1960,Vol:5,P.435

14 Ibid

15 Encyclopedia of Religion and Ethics ,Alfared E.Garway ,London ,1998,Vol:5,P.693

16 H.Maurice,Relton; Studies in Christian Doctrine,Macmillan ,London ,1960,P.3

17 Encyclopedia of Bratanica,"Trinity",London,1998,Vol:22,P.497

18 خیر اللہ، ایف ایس۔ قاموس الکتاب۔ لاہور: مسیحی اشاعت خانہ، ۲۰۰۵ء، ص: ۳۳

19 James Hastings, Dictionary of the Bible ,Edinburgh,1963,P.1015

20 Huston Smith , The Religions of Man ,New York,1965,P.33

21 خیر اللہ، ایف ایس۔ قاموس الکتاب۔ ص: ۲۳۴-۲۳۵

22 James Hastings ,Dictionary of the Bible ,P.414

23 یوحنا۱: ۱، ۲

24 یوحنا۱: ۱۴

25 یوحنا۲۰: ۱۷؛لوقا۲۳: ۵۳؛مرقس۱۵: ۴۶- ۴۷،متی۲۷: ۵۷-۶۰

26 The Encyclopedia Bartanica, "Atonement",London,1998,Vol:2,P.651

27 Huston Smith ,The Religions of Man,P.328

28 Adolf Harnack,History of Dogma ,London ,1898,Vol:4,P.136

29 The Encyclopedia Americana,2006,Vol:3,P.612

30 K.A .Dickson,The History and Religion of Israel ,London,1976,P.10-11

31 Encyclopedia Americana,Vol:3,P.612; The Holy Bible,Revised Standard Version, Catholic Edition ,London,1966,P.vi,ix

32 F.G. Bratton , A History of the Bible London,1961,P.99

33 The Catholic Bible, Revised standard Version,London,1966,P.448

34 American Peoples Encyclopedia,Vol:3,P.426

35 The Awake Magazine, watch Tower Society ,August 2,1979

36 Encyclopedia Bratanica,Vol:13,P:16-17

37 W.R.Inge,Christian Ethics And Modern Problems,London ,1930,P.43

38 خیر اللہ،ایف ایس۔ قاموس الکتاب۔ ص:۱۱۳۸

39 متی۱۰: ۶

40 متی۵: ۱۷-۱۹

41 مرقس۱۱: ۱۷-۱۵؛لوقا٦: ۱۲

42 رسولوں کے اعمال۔۳: ۱،نیز ملاحظہ ہو: Will Durant, The Story of Civilization New York 1972,Vol:3,P.575

43 Floyd H.Ross and Tynette Hills, Great Religions By Which Men live,New York, 1966,P.137

44 Hastings ,Dictionary of the Bible ,Clark, London, Vol:5,P.150

45 W.M. Ramsay,Saint Paul –The traveler, London,1907,P.30

46 H.G.Wells,The Outline of History,London,1956,P.537

47 مفتی، محمد تقی عثمانی۔عیسائیت کیا ہے۔اسلام آباد: دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء، ص: ٦۲-٦٦

48 چریاکوٹی، مولانا عنائت رسول۔ بشریٰ۔لاہور: ہجرہ انٹر نیشنل پبلشرز، ۱۹۸۴ء، ص: ۱۳-۲۲۴

49 ابنِ ہشام، ابو محمد عبدالملک (م۲۱۸ھ)۔السیرۃ النبویۃ۔ بیروت: دارالفکر، ۱۴۰۲ھ، ج:۱، ص:۱۸۰؛السہیلی، أبوالقاسم عبدالرحمن بن عبداللہ بن أحمد (م۵۸۱ھ)۔الروض الأنف في شرح السیرۃ النبویۃ لابن ھشام۔بیروت: داراحیاء التراث العربی، ۱۴۲۱ھ، ج:۱، ص:۱۱۸

50 ابنِ سعد۔طبقات۔ج:۱، ص:۷۵؛ بزار۔مسند۔ج:٦، ص:۴٦۲

51 ﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ آل عمران ۳: ۶۴، ترجمہ: کہہ دیں اے اہل کتاب آؤ (ایسی) بات کی طرف (جو) یکساں (مسلم) ہے ہمارے اور تمہارے درمیان یہ کہ نہ ہم عبادت کریں اللہ کے سوا (کسی کی) اور ہم شریک نہ بنائیں اس کے ساتھ کسی کو نہ بنائے ہم میں سے کوئی کسی کی رب اللہ کے علاوہ پھر اگر وہ منہ موڑلیں (اس بات سے) تو تم کہہ دو گواہ رہو کہ بے شک ہم تو مسلمان ہیں۔

52 بخاری، محمد بن اسماعیل۔ رقم: ۳؛ مسلم۔ رقم: ۱۶۰؛ ابنِ ہشام۔ السیرۃ النبویۃ۔ ج: ۲، ص: ۲۳۸

53 امام حاکم، محمد بن عبداللہ، ابو عبداللہ نیشاپوری (م ۴۰۵ھ)۔ المستدرک۔ بیروت: دار الفکر، ۱۳۹۸ھ، ج: ۲، ص: ۶۶۶

54 امام حاکم۔ المستدرک۔ ج: ۴، ص: ۴۳۵، رقم: ۸۴۸۷

55 ابنِ ہشام۔ السیرۃ النبویۃ۔ ج: ۲، ص: ۳۸۹

56 المائدہ ۵: ۶۷

57 طبرانی، سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني (م ۳۶۰ھ)۔ المعجم الكبير۔ قاهرة: مكتبة ابن تيمية، س۔ن، ج: ۸، ص: ۲۰

58 النصر ۱۱۰: ۱-۳

59 محمد طاہر الصدیقی القتنی۔ مجمع بحار الانوار فی غریب التنزیل ولطائف الاخبار۔ الہند: مجلس دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ۱۳۸۷ھ، ج: ۵، ص: ۶۷۶

60 ابنِ سعد۔ طبقات الکبریٰ۔ ج: ۱، ص: ۳۰۰-۳۴۸

61 اصفہانی، حسین بن محمد راغب۔ مفردات القرآن۔ لاہور: مکتبہ قاسمیہ، ۱۹۶۳ء، ص: ۶۶۵؛ افریقی، ابنِ منظور، جمال الدین محمد، ابوالفضل۔ لسان العرب۔ بیروت: دار صادر، ۱۹۹۵ء، ج: ۱۵، ص: ۱۲۳؛ وحید الزمان، علامہ۔ لغات الحدیث۔ کراچی، میر محمد کتب خانہ، مرکز علم وادب، ج: ۳، ص: ۳۸

62 رحمانی، عبداللطیف۔ غزوات وسرایا کا دعوتی کردار اور اس کے اثرات کا مطالعہ۔ تحقیقی مقالہ ایم فل علومِ اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، سیشن: ۲۰۰۲-۲۰۰۴ء، ص: ۷۶-۱۶۲

63 الأعراف ۷: ۱۵۷

64 العنکبوت ۲۹: ۴۶

65 سنن ابی داؤد، رقم: ۳۰۴۰ - ۲۷۵۳

66 بخاری۔ البخاری، کتاب الجنائز، باب: ماجاء فی قبر النبی وابی بکر وعمر۔ ج: ۳، ص: ۲۵۶